انتظار حسین کے افسانوں کا اسطوری بیانیہ

ڈاکٹر عبدالرزاق زیادی

شعبۂ اردو، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی، موبائل:9911589715

'اسطور' دراصل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنٰی سخنِ باطل، بناوٹی بات، روایتی قصہ، فرضی و پراسرار حکایت اور افسانہ وغیرہ کے ہیں۔ ابتداءً یہ لفظ انہی معانی میں یعنی عام قصے، کہانیاں اور حکایات وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا تھا، لیکن بعد میں یہ دیوی دیوتاؤں کے قصے اور کہانیوں کے لیے نہ صرف مستعمل ہونے لگا بلکہ انہی کے ساتھ مختص بھی ہو گیا اور صرف انہی قصے، کہانیوں کو اسطور کہا جانے لگا جن میں دیوی دیوتاؤں، راکشسوں اور مافوق فطری عناصر شامل ہیں۔ ہندی میں اس کے لیے دیو مالا اور انگریزی میں مِتھ جیسے الفاظ مستعمل ہیں۔ اسطور کیا ہے اور اس کے لغوی و اصطلاحی معنٰی و مفاہیم کیا ہیں اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''اسطور یا مِتھ یونانی زبان کے لفظ مائی تھوس سے ماخوذ ہے جس کا لغوی مفہوم ہے 'وہ بات جو زبان سے ادا کی جائے' یعنی کوئی قصہ یا کہانی۔ ابتداءً اسطور کا یہی تصور رائج تھا، لیکن بعد ازاں کہانی کی تخصیص کر دی گئی یوں کہ اسطور اس کہانی کا نام پایا جو دیوتاؤں کے کارناموں سے متعلق تھی یا ان شخصیتوں کی نمائندہ تھیں۔''(۱)

وزیر آغا کے اس اقتباس سے جہاں ایک طرف اسطور کی وضاحت ہوتی ہے وہیں دوسری طرف ان کی اس رائے سے اختلاف کی گنجائشیں بھی نکلتی ہیں۔ بلکہ Barry Powell جیسے ماہرین نے تو یہ کہتے ہوئے کہ Myth، ماخوذ ہے Muthos سے نہ کہ Mythos سے اختلاف سے ایک قدم آگے بڑھ کر سرے سے اس تصور کی ہی تردید کر دی ہے، لیکن یہاں اس اختلافی بحث کی گنجائش نہیں، بہر حال متذکرہ بالا اقتباس سے واضح ہو گیا کہ اسطور کے معنٰی قصہ و کہانی کے ہیں۔ ابتداءً اس سے مراد عام قصے اور کہانیاں لی جاتی تھیں، پھر بعد میں علمی و ادبی اور تہذیبی حلقے میں اسطور یا اساطیر کا استعمال ان قصے اور کہانیوں کے لیے ہونے لگا جو لوگوں کے مذہبی اعتقادات سے متعلق ہوتی ہیں، جو مافوق فطری اور مقدس اشخاص یا دیوی دیوتاؤں کے کارناموں سے ماخوذ ہوتی ہیں۔

دنیا کی ہر قوم کے پاس اپنی علیٰحدہ علیٰحدہ تہذیب و ثقافت موجود ہیں اور چونکہ اساطیر کا رشتہ تہذیب و ثقافت سے بہت گہرا ہوتا ہے اسی لیے دنیا بھر میں مختلف اساطیر مثلاً یونانی اساطیر، رومن اساطیر، مصری اساطیر، چینی اساطیر، جاپانی اساطیر، بدھ اساطیر، اسلامی اساطیر اور ہندو اساطیر وغیرہ بھی موجود ہیں۔ اسطور سے اگر دیوی دیوتاؤں کی کہانیاں مراد لی جاتی ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس سے مراد صرف وہی واقعات اور کہانیاں ہوتی ہیں جن کا تعلق دیوی دیوتاؤں، جن و شیاطین اور مافوق فطری عناصر وغیرہ سے ہو بلکہ اس کے برخلاف اس میں ہر طرح کے قصے و کہانیاں، واقعات و حادثات اور فرمودات و بیانات شامل ہیں۔ مشہور ماہر جمالیات شکیل الرحمان لکھتے ہیں:

> ''اساطیر اور اساطیری قصوں کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ سچائی بھی سامنے آجاتی ہے کہ تمام اسطوری قصے صرف دیوی دیوتاؤں سے تعلق نہیں رکھتے۔ ایڈی پس (Oedipus) کی مثال سامنے ہے جسے سگمنڈ فرائیڈ نے اپنا محبوب ہیرو بنا رکھا ہے۔ کئی یونانی اسطوری قصوں کے کردار دیوی دیوتا نہیں ہیں۔''(۲)

جس طرح دنیا کی ہر قوم میں ان کی تہذیب و ثقافت اور ایمان و اعتقادات سے متعلق اپنی اپنی دساتیر موجود ہیں اسی طرح دنیا کے جتنے بھی فنون لطیفہ اور ادب پارے ہیں ان میں بھی اس کے حوالے موجود ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دیگر زبان و ادب کی طرح اردو زبان و ادب کا دامن بھی ان سے پہلو تہی نہیں بلکہ اگر بغور دیکھا جائے تو عالمی تو نہیں مگر خود ہندوستان کی بہت سی زبان و ادب سے کہیں زیادہ اردو زبان و ادب اساطیری حوالوں سے پُر ثروت اور مالا مال نظر آتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس پر جس طرح کا کام ہونا چاہئے تھا وہ اب تک سامنے نہیں آسکا۔ کیونکہ اردو زبان و ادب کا شعری سرمایہ ہو یا نثری ہر ایک میں اساطیر کا چلن عام رہا ہے۔ اردو شعرا

کے یہاں تو عہد قدیم سے ہی اپنی تخلیقات میں اساطیر یا دیو مالاؤں سے استفادہ کا رجحان ملتا ہے۔ اردو کی پہلی کتاب 'مثنوی کدم راؤ پدم راؤ' میں بھی اس کی متعدد مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ بعد کی شاعری میں تو اساطیری حوالوں کا ایک انبار نظر آتا ہے۔ جنوبی ہند کے شعرا میں قلی قطب شاہ، نصرتی، ولی، سراج وغیرہ کے علاوہ خود شمالی ہند کے متعدد شعرا مثلاً آبرو، فائز، حاتم، شاکر ناجی، مرزا سودا، انشا، نظیر، نسیم، واجد علی شاہ، محسن کاکوروی، سرور، اکبر، حالی، حسرت، چکبست، اقبال، فراق، جوش، میراجی وغیرہ کی شاعری میں متعدد اساطیری حوالے تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

شاعری کی طرح اردو نثر پاروں میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ اردو کی قدیم نثری داستانوں میں تو اس کی ایک وسیع دنیا آباد نظر آتی ہے۔ ڈرامے میں اندر سبھا، رام لیلا، کرشن لیلا تو اس کی اہم مثالیں تصور کی جاتی ہیں۔ نثری اصناف میں صرف داستان یا ڈرامے ہی نہیں بلکہ اردو فکشن بھی اساطیری حوالوں سے مالا مال نظر آتا ہے۔ اردو فکشن میں بھی ناولوں کے مقابلے افسانوں میں اس کا رنگ گہرا نظر آتا ہے۔ کرشن چندر، دیوندر ستیارتھی، بلونت سنگھ، انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، جوگندر پال، بلراج مینرا، سریندر پرکاش، کمار پاشی، قمر احسن، سلام بن رزاق وغیرہ کے علاوہ موجودہ عہد کے بھی بہت سے ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں اساطیری عمل دخل نظر آتا ہے۔ یوں تو ان تمام فکشن نگاروں کو اپنے فکر وفن کے اعتبار سے ہمارے ادب میں بڑی اہمیت ووقعت حاصل ہے مگر ان میں بھی انتظار حسین کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے، لیکن اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ اردو ادب کی تاریخ میں ان کی شناخت جہاں ایک افسانہ نگار، ایک ناول نگار اور ایک ڈراما نگار کی ہے وہیں وہ ایک قابل قدر مترجم، نکتہ داں نقاد، مقبول عام کالم نویس اور مشہور صحافی بھی ہیں بلکہ فکشن نگاروں کے اس کہکشاں میں ان کی بنیادی شناخت کی وجہ ان کا منفرد بیانیہ اور اچھوتا اسلوب ہے اور ان کا یہی وہ اسلوب و بیان ہے جس نے جہاں ان کو فکشن نگاروں میں ایک پہچان دلائی وہیں اس سے اردو افسانہ کے دامن میں وسعت بھی پیدا ہوئی۔ گوپی چند نارنگ اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

> ''انتظار حسین اس عہد کے اہم ترین افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ اپنے پُر تاثیر تمثیلی اسلوب کے ذریعے انھوں نے اردو افسانے کو نئے فنی اور معنیاتی امکانات سے آشنا کرایا ہے اور اردو افسانے کا رشتہ بیک وقت داستان، حکایت، مذہبی روایتوں، قدیم اساطیر اور دیو مالا سے ملا دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ناول اور افسانے کی مغربی ہیئتوں کی بہ نسبت داستانی انداز ہمارے اجتماعی لاشعور اور مزاج کا کہیں زیادہ ساتھ دیتا ہے۔ داستانوں کی فضا کو انھوں نے نئے احساس اور نئی آگہی کے ساتھ کچھ اس طرح برتا ہے کہ افسانے میں ایک نیا فلسفیانہ مزاج، اور ایک نئی اساطیری و داستانی جہت سامنے آگئی ہے۔'' (۳)

انتظار حسین کے افسانوں کا یہی وہ فلسفیانہ مزاج اور نیا اساطیری و داستانی بیانیہ ہے جو انھیں نہ صرف اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے ممتاز بناتا ہے بلکہ اس سے ان کے افسانوں میں کتھا کاری کی صفت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ انتظار حسین کا یہی بیانیہ اور اسلوب فنی اعتبار سے اردو افسانے کو رومانویت سے روحانیت کے دائرے میں لے آتا ہے اور انتظار حسین کے اس رویے سے فکشن اور فرد وسماج کے مابین ایک خاص ربط وضبط پیدا ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے گوپی چند نارنگ ایک جگہ رقمطراز ہیں:

> ''عہد نامہء قدیم واساطیر و جاتک اور دیو مالا کی مدد سے ان کو استعاروں، علامتوں اور حکایتوں کا ایسا خزانہ ہاتھ آگیا ہے جس سے وہ پیچیدہ پیچیدہ خیال اور باریک سے باریک احساس کو سہولت کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں ایسی سادگی اور تازگی ہے جس کی کوئی نظیر اس سے پہلے اردو میں نہیں ملتی۔ برصغیر میں کہانی کی روایت کتھا کی روایت ہے۔ داستان نے بھی اس لحاظ سے اسی روایت کو آگے بڑھایا تھا کہ وہ سننے سنانے کی چیز ہے۔ اس کے برخلاف بیسویں صدی میں افسانے کا سارا ارتقا ایک تحریری صنف کا ارتقا ہے۔ یہ لکھے اور پڑھے جانے کی چیز ہو کر رہ گیا تھا۔ انتظار حسین نے باصرہ کے ساتھ سامعہ کو پھر سے بیدار کیا ہے اور کہانی کی روایت میں سننے اور سنائے جانے والی صنف کے لطف کا از سر نو اضافہ کیا ہے۔ یہ صرف داستان کے اسلوب ہی کی تجدید نہیں بلکہ کتھا کی ہزاروں سال پرانی روایت کی تجدید بھی ہے۔'' (۴)

انتظار حسین کی بیشتر کہانیوں میں اسطور کا یہ بیانیہ اور کتھا کا لطف موجود ہے۔ یوں تو انتظار حسین کے پانچ ناول اور تین ڈراموں کے علاوہ دس افسانوی مجموعے دستیاب ہیں۔ ان کے ابتدائی دور کے افسانے روایتی انداز کے تھے۔ گلی کوچے (۱۹۵۱ء) اور کنکری (۱۹۵۷ء) کے افسانے اس حوالے سے دیکھے جاسکتے ہیں مگر ان کے یہاں ایک نیا رنگ اس دکھائی دیتا ہے جب ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ 'آخری آدمی' سامنے آتا ہے۔ یہ مجموعہ اگرچہ ۱۹۶۷ء میں پہلی بار منظر عام پر آیا تھا، لیکن انتظار حسین نے ۱۹۶۰ء سے قبل سے بھی نئی کہانیاں لکھنی شروع کردی تھیں۔ یہ

اور بات ہے کہ آخری آدمی میں اپنے تخلیقی اظہار کے لیے ان کے یہاں اساطیر عمل بھرپور طریقے سے سامنے آیا۔ خود افسانہ 'آخری آدمی'، جس نام سے جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ایک مکمل مجموعہ ہے، انتظار حسین کے اسطوری بیانیہ کا سب سے اہم اور قابلِ ذکر نمونہ ہے۔

افسانہ 'آخری آدمی' میں جیسا کہ یہ ہمارے بی۔اے اور ایم۔اے وغیرہ کے نصابوں میں شامل ہے اور ہم میں سے اکثر و بیشتر واقف ہیں کہ اس میں قرآن پاک اور اس عہد نامہ عتیق کی فضا ہے۔ یہ وہ کہانی ہے جو سورۂ اعراف آیت نمبر ۱۶۳ تا آیت نمبر ۱۶۶ میں بالتفصیل موجود ہے اور اسی کا اجمالی ذکر سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۶۵ میں "**ولقدعلمتم الدین اعتدو منکم فی السبت فقلنا لھم کونو ا قردۃخاسئین**" جیسے پیرائے میں بیان ہوئی ہے۔ اس کہانی میں ان انسانوں کے بندر بن جانے کا حال بیان ہوا ہے جو تمام تر ممانعتوں کے باوجود سبت یعنی سنیچر کے روز مچھلیاں پکڑنے کا کام کرتے تھے اور اپنے حرص و ہوس کے جذبے کی تسکین کرتے تھے۔ لالچ، خوف، غصہ، وسوسہ وغیرہ جیسے منفی جذبات کے باعث وہ برتر انسانی سطح سے بدتر ہی نہیں بلکہ حیوانی سطح پر اتر گئے تھے۔ کہانی کی ابتدا الیاسف سے ہوتی ہے جو کہ اس قریے کا آخری آدمی تھا اور جس نے عہد کیا تھا کہ معبود کی سوگندھ میں اگر وہ آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہے تو آدمی ہی کی جون میں مرے گا۔ اس کے لیے اس نے آخری دم تک بہتیرے کوششیں بھی کیں مگر بالآخر:

> ''بھاگتے بھاگتے تلوے اس کے دکھنے لگے اور چپٹے ہونے لگے اور کمر اس کی درد کرنے لگی اور وہ بھاگتا رہا اور کمر کا درد بڑھتا گیا اور اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی دوہری ہوا چاہتی ہے اور وہ دفعتاً جھکا اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں۔ الیاسف نے جھک کر ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں اور بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا چاروں طرف پیروں کے بل تیر کے موافق چلا۔''(۵)

اس طرح لاکھ کوششوں کے باوجود بھی قریے کا آخری آدمی یعنی الیاسف بھی بندر بن جاتا ہے۔ اس کے بندر بن جانے کے دو اسباب تھے پہلا ذاتی اور دوسرا معاشرتی۔ ذاتی سبب یہ ہے کہ الیاسف نے اللہ کے ساتھ مکر کیا۔ کہانی کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''سمندر سے فاصلے پر ایک گڑھا کھودا اور نالی کھود کر اُسے سمندر سے ملایا اور سبت کے دن مچھلیاں سطحِ آب پر آئیں تو تیرتی ہوئی نالی کی راہ گڑھے میں نکل گئیں اور سبت کے دوسرے دن الیاسف نے اس گڑھے سے بہت سی مچھلیاں پکڑ لیں۔''(۶)

معاشرتی اسباب کچھ اس طرح بیان ہوئے ہیں:

> ''الیاسف کے تئیں لفظوں کی قدر جاتی رہی کہ اب وہ اس کے اور اس کے ہم جنسوں کے درمیان رشتہ نہیں رہے تھے اور اس کا اس نے افسوس کیا۔ الیاسف نے افسوس کیا اپنے ہم جنسوں پر، اپنے آپ پر اور لفظ پر۔ افسوس ہے ان پر بوجہ اس کے کہ وہ لفظ سے محروم ہو گئے۔ افسوس ہے مجھ پر کہ بوجہ اس کے کہ لفظ میرے ہاتھوں میں خالی برتن کی مثال رہ گیا اور سوچو تو آج بڑے افسوس کا دن ہے کہ لفظ مر گیا۔''(۷)

چونکہ لالچ اور مکر داخلی طور پر اور لفظوں کی موت خارجی طور پر روحانی زوال اور معاشرتی رشتوں کی شکست و ریخت کی علامت ہے اور انتظار حسین کے نزدیک ان دونوں لفظوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ افسانہ نگار ہمیں بتاتا ہے:

> ''اس شخص نے جو انھیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کرتا تھا یہ کہا کہ بندر تو تمہارے درمیان موجود ہیں مگر یہ کہ تم دیکھتے نہیں۔''(۸)

اس طرح افسانہ ''آخری آدمی'' میں ہوس کاری اور لفظ کی موت انسانوں کو معاشرتی اور تہذیبی سطح سے بندروں کی حیوانی سطح پر اتار دیتی ہے۔ آخری آدمی کی طرح ''زرد کتا'' بھی انتظار حسین کا ایک اہم افسانہ ہے بلکہ اس کا شمار ان کی شاہکار کہانیوں میں ہوتا ہے۔ اس میں بھی عہد وسطیٰ کے بزرگانِ دین کے ملفوظات اور داستانوی زبان کا نہایت ہی حسین اور کامیاب استعمال موجود ہے۔ افسانے کی شروعات اس طرح ہوتی ہے:

> ''ایک چیز لومڑی کا بچہ ایسی اس کے منہ سے نکل پڑی۔ اس نے اسے دیکھا اور پاؤں کے نیچے ڈال کر روندنے لگا مگر وہ جتنا روندتا تھا اتنا وہ بچہ بڑا ہوتا جاتا تھا۔''(۹)

اس افسانے میں انسانی نفس یعنی نفس امارہ لومڑی کی شکل میں آدمی کی ذات سے باہر آتا ہے۔ اسے جتنا دبانے کی کوشش کی جاتی ہے اتنا ہی وہ موٹا ہوتا جاتا ہے۔ زرد کتا بھی بقول باقر رضوی انسانی نفس کی خارجی صورت ہے کہ اسے بھگانے اور نکالنے کی کوشش کیجیے تو دامن میں چھپ کر غائب ہو جاتا ہے۔ گوپی چند نارنگ لومڑی کے بچے یعنی نفس امارہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ لومڑی کا بچہ انسانی نفس ہے۔ تاہم نفس سے مراد صرف نفس

نہیں ہے بلکہ انسانی جبلتوں کا وہ سارا نظام ہے جو انسان کو مسلسل ایک کشمکش سے دو چار رکھتا ہے اور جب کسی فرد یا معاشرے میں نفس کا عمل دخل حد اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے، تو فرد یا معاشرہ شدید روحانی اور اخلاقی بحران سے دوچار ہو جاتا ہے۔''(۱۰)

کہانی 'زرد کتا' میں بھی ہمارے اسلاف اور بزرگانِ دین کے ملفوظات کی زبان میں حرص و ہوس کے باعث روحانی انحطاط کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔اس کہانی کی تکنیک میں انتظار حسین نے مکالموں اور حکایتوں کو اس سلیقے اور ہنرمندی سے ایک دوسرے کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اس سے نہ صرف ایک جدت پیدا ہوگئی ہے بلکہ یہ قاری کو کہانی ٹھہر ٹھہر کر اور سمجھ سمجھ کر پڑھنے پر مجبور بھی کرتی ہے۔انتظار حسین کی اس کہانی کا مرکزی خیال آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

''میں یہ سن کر عرض پرداز ہوا۔'یا شیخ زرد کتا کیا ہے؟' فرمایا:

'زرد کتا تیرا نفس ہے۔' میں نے پوچھا:

'یا شیخ نفس کیا ہے؟' فرمایا:

'نفس طمع دنیا ہے۔' میں نے سوال کیا:

'یا شیخ طمع دنیا کیا ہے؟' فرمایا:

'طمع دنیا پستی ہے۔' میں نے استفسار کیا:

'یا شیخ پستی کیا ہے؟' فرمایا:

'پستی علم کا فقدان ہے۔' میں ملتجی ہوا:

'یا شیخ علم کا فقدان کیا ہے؟' فرمایا:

'دانشمندوں کی بہتات۔' میں نے کہا:

'یا شیخ تفسیر کی جائے۔' آپ نے تفسیر بصورت حکایت فرمائی۔''(۱۱)

چنانچہ یہ تفسیر بصورت حکایت فرمائی گئی اور وہ حکایت ایک بادشاہ اور وزیر کی تھی۔ پھر اس حکایت کی تفسیر و توضیح میں دوسری حکایتیں بھی آتی ہیں، لیکن اس کا جو مرکزی خیال ہے اور اس سے افسانہ نگار ہمارے سماج اور معاشرہ کے جس نکتے کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ دراصل ہمارا معاشرتی انحطاط و زوال ہی ہے۔سجاد باقر رضوی مجموعہ آخری آدمی کے مجموعے میں لکھتے ہیں:

''اس مرکزی خیال کو اس افسانہ میں انفرادی و معاشرتی دونوں حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔چھوٹی چھوٹی حکایتوں اور واقعات کو جوڑ کر کہانی کا پورا ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے۔'' آخری آدمی'' کی طرح اس کہانی میں بھی پورے معاشرتی انحطاط میں ایک شخص کے روحانی انحطاط کو دکھایا گیا ہے۔بدی ایک وبا کی طرح تیزی سے پھیلتی ہے جس میں فرد اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود، اسی بدی کا شکار ہو جاتا ہے جس سے وہ بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔''زرد کتا'' یعنی نفس امارہ پوری روحانی زندگی کے لیے ایک چیلنج ہے، لیکن اس کہانی کا آخری آدمی اپنے نفس امارہ کے ساتھ کشمکش جاری رکھتا ہے اور بالآخر خدا سے پناہ مانگتا ہے''بارِ الٰہا آرام دے، آرام دے، آرام دے'' اور اس طرح وہ غیبی امداد کے بھروسے آدمی کی جون میں ہی رہتا ہے۔زرد کتا نفس امارہ کے حوالے سے فرد کی روحانی زندگی کے انحطاط کی کہانی ہے مگر یہی بات معاشرتی انحطاط کی وجہ بن جاتی ہے۔نفس کا دوزخ بھرنے والے 'آخری آدمی'' بندر بن جاتے ہیں اور اس کہانی میں وہ سماعت سے محروم ہو جاتے ہیں۔روحانی طور پر انحطاط پذیر معاشرے میں صاحبِ کلام منہ پر تالا ڈال دیتے ہیں اور زندہ انسان سماعت سے محروم ہو جاتے ہیں۔''(۱۲)

اس طرح لفظ مر جاتے ہیں اور لفظوں کی موت سے نہ صرف ان کی اہمیت کم ہو جاتی ہے بلکہ زندگی کی معنویت بھی ختم ہو جاتی ہے اور مردے زندوں سے بہتر اور کارآمد ہو جاتے ہیں۔کہانی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''وہ (سید علی الجزائری) قبرستان میں گئے اور منبر چڑھ کر ایک بلیغ خطبہ دیا۔اس کا عجیب اثر ہوا قبروں سے درود کی صدا بلند ہوئی۔تب سید علی الجزائری نے آبادی کی طرف رخ کر کے گلوگیر آواز میں کہا: اے شہر تجھ پر خدا کی رحمت ہو تیرے جیتے لوگ بہرے ہو گئے اور تیرے مردوں کو سماعت مل گئی۔''(۱۳)

یقیناً جب انسان اپنے اوصافِ انسانیت کھو دے یعنی جب جیتے سماعت سے محروم ہو جائیں، لفظ بے معنی و بے مراد اور کھوکھلے ہو جائیں اور زندگی کی حقیقت و معنویت ختم ہو جائے تو ایسی صورت میں انسان اپنی انسانیت کی سطح سے گر جاتے ہیں۔

آخری آدمی اور زرد کتا کے علاوہ کشتی، زمران، کانا دجال، شرم الحرم، وہ جو دیوار نہ چاٹ سکے وغیرہ انتظار حسین کے ایسے افسانے ہیں جن میں انھوں نے اسطوری پیرایے سے بھرپور کام لیا ہے بلکہ ان میں تو بعض کہانیاں ایسی بھی ہیں جو اپنے نام یا عنوان سے ہی واضح ہیں کہ وہ کس کہانی، داستان یا حکایات و واقعات سے ماخوذ و مستعار ہیں۔ان تمام کہانیوں میں بھی افسانہ آخری آدمی اور زرد کتا کی طرح بزرگان دین کی ملفوظات اور حکایات واقعات سے نہ صرف کام لیا گیا ہے بلکہ ان میں بھی

مکالموں کی تکنیک کا فنکارانہ استعمال بھی موجود ہے۔افسانہ ''کشتی'' میں انتظار حسین نے اساطیر کے استعمال کی جو مہارت اور فنی چابکدستی کا ثبوت فراہم کیا ہے اس کی مثال کم ہی فنکاروں کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔اس کہانی میں افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے نہ صرف قدیم سامی و اسلامی اور ہندوستانی اساطیری روایتوں کا استعمال کیا ہے بلکہ ان قدیم اساطیری فکر و عمل اور روایات کو جدید فکر سے موازنہ کر کے ان میں ایک نئی تعبیر بھی پیدا کی ہے۔گوپی چند نارنگ اس افسانے کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

''اس دور کی بہترین تمثیلی کہانی بہر حال ''کشتی'' ہے۔اس میں قدیم سامی و اسلامی روایتوں اور ہندوستانی دیومالائی حکایتوں کو تخلیقی طور پر مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس لحاظ سے یہ افسانوی تکنیک کا ایسا تجربہ ہے جس کی کوئی مثال اس سے پہلے اردو میں نہیں ملتی۔''کشتی'' میں مسئلہ نسلِ انسانی کی تباہی و بربادی اور اس کی بقا Survival کا ہے۔اس کی ایک جہت ہنگامی مقامی بھی ہوسکتی ہے اور ایک دائمی آفاقی بھی۔یہ دنیا جب ظلم و ستم سے بھر جاتی ہے تو تباہی و بربادی کا دور آتا ہے اور ہر چیز نیست و نابود ہو جاتی ہے۔اس کا ذکر تمام مذہبی روایتوں میں آیا ہے،خواہ قہرِ الٰہی کی صورت میں ہو،آفاتِ ارضی وسماوی کی صورت میں، یا طوفان و سیلابِ بلا کی صورت میں۔مدتوں تک پیڑ پودے، جن و انس سب تہہ آب غرق ہو جاتے ہیں، کسی آبادی کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا،لیکن خدا ابھی اپنی تخلیق سے مایوس نہیں اور اس طرح انسان کو ایک موقع اور مل جاتا ہے۔''کشتی'' میں نہ صرف قرآن پاک بلکہ عہد نامۂ قدیم، توریت اور ویدوں، پرانوں اور شاستروں سب کی مذہبی اور اساطیری روایتوں سے مدد لی گئی ہے اور بقائے انسانی کے بارے میں بنیادی سوالات قائم کیے گئے ہیں۔''(۱۴)

متذکرہ بالا افسانوں کے علاوہ زمران، کانا دجال، اور شرم الحرم، کچھوے، دوسرا گناہ، پتے اور وہ جو دیوار نہ چاٹ سکے وغیرہ میں بھی انتظار حسین کے یہاں اساطیری روایات سے عمل دخل ملتا ہے۔ان میں بھی انھوں نے بڑی فن کاری اور خوش اسلوبی کے ساتھ نہ صرف عہد نامہ قدیم،انجیل،قصص الانبیاء، ہندو دیومالا، بودھ جاتیکائیں،قرآن پاک، داستانوں اور صوفیا کرام کے ملفوظات سے نہ صرف استفادہ کیا ہے بلکہ ان کے ذریعے انھوں نے انسان اور معاشرے کے روحانی و اخلاقی زوال،انسانی خودغرضی،ریاکاری اور نفس پرستی کو اجاگر کیا ہے۔

اس طرح انتظار حسین نے اپنے افسانوں اور کہیں کہیں اپنے ناولوں میں بھی اساطیری بیانیہ سے کام لیتے ہوئے انسان کو اس کے فرائض یاد دلایا ہے اور تطہیر ذات کی طرف مائل کیا ہے۔اس حوالے سے انتظار حسین نے اپنی کہانیوں میں اساطیر کا جس قدر موزوں، مناسب اور بھرپور استعمال کیا ہے اس کی نظیر شاید ہی کسی اور اردو و غیر اردو کہانی کار و فکشن نگار اور شاعر و ادیب کے یہاں نظر آتی ہو۔اردو فکشن نگاروں میں انتظار حسین سے قبل بیدی کے افسانوں میں اساطیری حوالے بکثرت ملتے ہیں،لیکن ان کے یہاں ہندو اساطیر کا غلبہ ہے اور وہ اساطیر کا استعمال محض افسانوں میں گہری معنویت پیدا کرنے کے لیے کرتے ہیں،لیکن اس کے برخلاف انتظار حسین کے یہاں عام اساطیر کا بھرپور اور متوازن استعمال نظر آتا ہے۔انتظار حسین کے افسانوں کی یہی وہ خصوصیات اور اسطوری بیانیہ ہے جو انھیں اردو کے دیگر فکشن نگاروں سے ممیّز و ممتاز بناتے ہیں اور اس کی بدولت اسطوری ادب میں ان کا نام ہمیشہ نمایاں رہے گا۔

حواشی:

۱۔ وزیر آغا،تخلیقی عمل،علی گڑھ بک ڈپو،۱۹۷۵ء،ص:۳۹

۲۔ شکیل الرحمٰن،اساطیر کی جمالیات،نرالی دنیا پبلی کیشنز،۲۰۰۹ء،ص:۱۲

۳۔ گوپی چند نارنگ،انتظار حسین کا فن متحرک ذہن کا سیال سفر،مشمولہ عالمی اردو ادب(نند کشور وکرم)دہلی،۲۰۱۶ء،ص:۲۶۹

۴۔ ایضاً،ص:۲۶۹

۵۔ انتظار حسین، آخری آدمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۱۹۹۳، ص:۲۸ ۶۔ ایضاً،ص:۲۶۔۲۷

۷۔ ایضاً،ص:۲۴۔۲۵ ۸۔ ایضاً،ص:۲۱

۹۔ انتظار حسین، افسانہ'' زرد کتا'' مشمولہ مجموعہ آخری آدمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۱۹۹۳ء،ص:۲۹

۱۰۔ گوپی چند نارنگ،انتظار حسین کا فن متحرک ذہن کا سیال سفر،مشمولہ عالمی اردو ادب(نند کشور وکرم)دہلی،۲۰۱۶ء،ص:۲۷۷

۱۱۔ انتظار حسین، افسانہ'' زرد کتا'' مشمولہ مجموعہ آخری آدمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۱۹۹۳ء،ص:۳۲

۱۲۔ ایضاً،مقدمہ،ص:۱۵

۱۳۔ انتظار حسین، افسانہ'' زرد کتا'' مشمولہ مجموعہ آخری آدمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۱۹۹۳ء،ص:۳۱

۱۴۔ گوپی چند نارنگ،انتظار حسین کا فن متحرک ذہن کا سیال سفر،مشمولہ عالمی اردو ادب(نند کشور وکرم)دہلی،۲۰۱۶ء،ص:۳۰۷ ◆◆◆